جناب محمد عطاء اللہ صدیقی

خاتونِ خانہ کی محنت کا معاوضہ.....؟

آزادیٔ نسواں کی علمبردار مغرب زدہ بیگمات کی طرف سے بعض ایسے مطالبات پیش کئے جارہے ہیں کہ اگر ان کو تسلیم کرلیا جائے تو ان کا یقینی نتیجہ عورتوں کی تکریم میں اضافے کی بجائے ان کی تحقیر کی صورت میں سامنے آئے گا' گزشتہ چند برسوں سے مغربی خواتین کے اتباع میں ہمارے ہاں کی این جی اوز کی ''گردش خیال'' بیگمات ''خاتونِ خانہ'' کی محنت کے معاوضہ کے مسئلے کو بہت اچھال رہی ہیں۔ گزشتہ دنوں یہی موضوع سیمیناروں کے علاوہ اخبارات کی زینت بھی بنا رہے ہے' ان کا کہنا ہے کہ ''خاتون خانہ'' کو اس کے تمام دن کی محنت کا معاوضہ دیا جائے یا کم از کم اس کی اس بلا معاوضہ شبانہ روز محنت کا اعتراف ہی کرلیا جائے جسے وہ اپنا صلہ تسلیم کرلے گی''۔ یہ مطالبہ جس قدر لغو ہے اتنا نامعقول بھی ہے۔ کوئی بھی معقول گھریلو خاتون اپنے بارے میں اس حقارت آمیز تصور کو تسلیم نہیں کرے گی۔ کوئی بھی خاتون ''گھر کی ملکہ'' کے قابل احترام مقام سے اپنے آپ کو ''گھریلو خادمہ'' کے درجہ تک گرانے کی اجازت نہیں دے گی۔ بے حد افسوس کا مقام ہے کہ بعض مغربی تہذیب کی دلدادہ پاکستانی بیگمات گھریلو ماحول کے تقدس اور ایک فیکٹری کے ماحول کی تاجرانہ مادہ پرستی میں کوئی فرق مراتب قائم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ان کی سوچ سطحی جذباتیت پر مبنی ہے ان کی فکر حقیقت پسندی اور معروضیت سے قطعاً عاری ہے۔ ایک خاتون کالم نگار مسرت لغاری صاحبہ نے ۱۷ر فروری کے ''نوائے وقت'' میں اس حساس موضوع پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے' اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے' وہ لکھتی ہیں:

''میرے خیال میں وہ معمولی مزدور ایک عورت کی نسبت بدرجہا بہتر ہے جو کسی مالک مکان سے مزدوری کے لئے چند گھنٹوں کا معاہدہ کرتا ہے' اینٹوں پتھروں سے گھر بناتا ہے اور شام کو معاوضہ لے کر گھر چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس عورت جو ایک شخص کے ساتھ شرعی معاہدے میں بندھی ہوتی ہے' اس کے اندر دن رات محنت مزدوری کرتی ہے' اینٹوں روڑوں کے بجائے اپنے خون پسینے سے گھر بناتی ہے' بچوں کی پیدائش و پرورش اور تعلیم و تربیت کے اہم ترین مراحل سے گزرتی ہے' اس کی ان تمام قربانیوں کو نظر انداز کر کے اندھے کنوئیں میں ڈال دیا جاتا ہے..... کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ وہی عورت اگر ساتھ کے گھر میں جا کر برتن مانجھے' مزدوری کرے تو اسے اس کی مزدوری مل جائے اور یہ کام وہ اپنے گھر میں کرے تو اسے نہ صرف یہ کہ معاوضہ نہ ملے' بلکہ شوہر سے دشنام وصول ہو۔''

مسرت لغاری صاحبہ اور ان کے ہم خیال بیگمات جدیدہ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس جذباتی استدلال کو بھول جائیں تو ان کی خدمت میں چند معروضات پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

(۱)　ایک گھر کا نظم ونسق چلانا شوہر اور بیوی کی مشترکہ ذمہ داری ہے' اس مشترکہ ذمہ داری میں سخت ترین کام یعنی نان ونفقہ کی ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہے۔ خاتون خانہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مرد کی کمائی کو خاندان کی اجتماعی فلاح' جسمانی ضروریات اور اولاد کی تعلیم وتربیت پر احسن طریقے سے خرچ کرے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک اگر اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے انجام نہ دے تو گھر کا نظم ونسق اور اجتماعی نقشہ بری طرح متاثر ہوگا۔

(۲)　چند استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر' عام مشاہدہ یہ ہے کہ مرد عام طور پر اپنی کمائی کا بیشتر حصہ یا بعض صورتوں میں تمام کی تمام کمائی اپنی بیوی کے حوالہ کر دیتا ہے جسے وہ گھریلو ضروریات پر خرچ کرتی ہے' باورچی خانہ' ملبوسات' تعلیم و تربیت اور دیگر بنیادی ضروریات کی تکمیل مرد کی اسی آمدنی سے کی جاتی ہے۔ ان سارے اخراجات کو پورا کرنے کے بعد بھی اگر اضافی آمدنی ہو تو محنت کرنے والے شوہر اپنے اہل خانہ پر کھلے دل سے خرچ کرنے میں دریغ نہیں کرتے' نجانے ان حقائق کو جذبات کی رو میں کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

(۳)　کوئی بیوی گھریلو کام یا اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت نہ اس خیال سے کرتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی ''تنخواہ دار ملازم'' ہے اور نہ ہی کوئی شوہر اپنی کمائی اپنی بیوی کے حوالے اس نیت سے کرتا ہے کہ وہ اسے اسکی گھریلو خدمات کا ''معاوضہ'' سمجھتا ہے۔ میاں بیوی کے تعلق کو ایک مالک اور مزدور کے تعلق سے مشابہ قرار دینا بذات خود ایک مکروہ اور لغو سوچ ہے' رشتوں کے یہ دونوں دائرے اس قدر مختلف ہیں کہ انکا آپس میں موزانہ غیر منطقی اور غیر حقیقت پسندانہ ہے

(۴)　خانگی امور سے متعلقہ ذمہ داریوں پر غور کیا جائے تو مرد کی ذمہ داریاں بدرجہا مشقت طلب ہیں' عورت کا گھریلو ذمہ داریاں نبھانا مشکل امر سہی' لیکن اس کا موازانہ اگر مرد کی بیرون خانہ محنت مزدوری سے کیا جائے تو یہ ہر لحاظ سے سہل ہیں۔ گھریلو کام کو ''اینٹوں اور روڑوں'' سے تشبیہہ دینا بڑا آسان ہے' اگر کسی عورتوں کو عملاً بیرون خانہ محنت مزدوری کرنی پڑ جائے تو ان کے لئے یہ ایک عذاب سے کم نہیں ہے۔

(۵)　مغرب زدہ بیگمات کے اس بھونڈے استدلال کو قابل لحاظ مان لیا جائے تو پھر باورچی خانہ اور بچوں کی تعلیم وتربیت کے ''معاوضہ'' تک ہی اس مسئلے کو محدود کیوں رکھا جائے؟ آج ایک مزدور کو عام عورت سے ''بدرجہا بہتر'' قرار دینے والی عورتیں' کل کلاں اسے ایک طوائف سے بھی ''بدتر'' قرار دے سکتی ہیں۔ وہ یہ استدلال بھی لا سکتی ہیں کہ جب ایک طوائف کو اس کی ''خدمت'' کا معاوضہ دیا جاتا ہے تو پھر ایک بیوی سے صنفی مواصلت کا معاوضہ ادا کیوں نہ کیا جائے؟

(۶)　تحریک نسواں کی علمبردار عورتوں کے استدلال کی بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ خاندانی زندگی کے صرف منفی پہلو پر نگاہ رکھتی ہیں' اس کے مثبت پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہیں' ان کے نقطہ نظر کی دوسری خامی یہ ہے کہ وہ مرد اور عورت کے مابین تعلق کے متعلق Over Generalization یعنی غیر ضروری تعمیمات قائم کر لیتی ہیں۔ اگر ہمارے ہاں

بعض گھرانوں کی کچھ عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا تو وہ فرض کر لیتی ہیں کہ تمام عورتوں کی حالت قابل رحم ہے۔ تحریک آزادی نسواں کے جذباتی لٹریچر نے انہیں اس قدر مشتعل (Charged) کر دیا ہے کہ ان کی سوچ جذباتی ہیجان خیزی کے دائرے میں داخل ہو گئی ہے۔

آج سے دو سو سال پہلے میری وولسٹن کرافٹ نے حقوق نسواں کے موضوع پر لکھی جانے والی اپنی کتاب میں مرد و زن کی عدم مساوات اور خواتین کی مظلومیت کی جو جذباتی تصویر کشی کی تھی آزادی نسواں کی علمبردار عورتوں کی تحریروں میں آج بھی وہی جذباتیت جھلکتی ہے حالانکہ آج عورتوں کو معاشرے میں جو مقام و مرتبہ حاصل ہے سو سال سے پہلے کی حالت سے اس کا موازانہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس بنیادی فرق کو یہ جذباتی خواتین یکسر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ لاہور جیسے شہر میں جہاں کے تعلیمی ادارے، گلی، محلے، بازار، پارک اور ہوٹل عورتوں کی وسیع پیمانے پر آزادی اور چلت پھرت کے ناقابل تردید مقامات ہیں، وہاں بیٹھ کر حقوق نسواں کے موضوع پر جذباتی کالم لکھنا بے حد عجیب لگتا ہے۔ لاہور میں تو عورتیں گھریلو زندگی پر اس قدر غالب نظر آتی ہیں کہ یہاں ''تحریک آزادئ مرداں'' شروع کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ انڈیا میں یہ تحریک پہلے ہی شروع کی جا چکی ہیں۔

(۷) مسرت لغاری صاحبہ جیسی خواتین سے ہماری گزارش ہے کہ وہ جذباتی رنگ آمیزی کے شوق میں حقائق کو نظر انداز نہ کریں، کیا کوئی معقول شخص مسرت لغاری کی اس بات پر یقین کرے گا: ''بہت سی تعلیم یافتہ ملازم خواتین جو دفتر اور گھر کی دوہری مزدوری کے دوہرے جبر تلے زندگی گزار رہی ہیں اور انہیں ''اُف'' تک کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ شوہر کے گھر آنے پر اسے روتی آنکھوں کے ساتھ مسکرانے کا حکم بھی ہے۔''

نجانے یہ ''روتی آنکھوں کے ساتھ مسکرانے کا حکم'' بجالانے والی مجبور و بے بس ملازم خواتین کس گلی محلے میں رہتی ہیں؟ ہمارے معاشرے میں ایک بھی ملازم پیشہ خاتون ایسی نہیں ہے جسے اس ذلت سے گزرنا پڑتا ہو، مگر خاتون کالم نگار اس طرح کی جذباتی تصویریں کھینچنے پر مصر ہیں۔ عام مشاہدہ تو یہ ہے کہ ملازم پیشہ خواتین کا اپنے شوہروں سے برتاؤ باغیانہ، تحکمانہ اور بعض صورتوں میں بدتمیزانہ ہوتا ہے۔ راقم الحروف کی رہائش کے آس پاس کم از کم بیس خواتین ملازم پیشہ ہیں، ان کی اکثریت کا اپنے شوہروں سے سلوک بے حد ''حاکمانہ'' ہے۔ شوہروں کے خلاف زبان درازی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کے شوہر واقعی مظلوم ہیں۔ ایک خاتون لیکچرر جو سرکاری مکان میں رہتی ہیں، اپنے میاں سے ہر ماہ باقاعدگی سے کرایہ وصول کرتی ہیں۔ آخر ان عریاں حقائق کی موجودگی میں عورتوں کی خود ساختہ مظلومیت کا رونا روتے رہنا کہاں کی معقولیت ہے؟

مسرت لغاری صاحبہ نے اپنے کالم میں یہ ثابت کرنے کی کاوش کی ہے کہ چونکہ ہماری عدالتوں میں زیادہ تر مرد ہی جج ہیں، لہٰذا مردوں کی عدالتوں سے عورتوں کو انصاف مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ مرد کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

''قانون اس کا ہے' عدالتیں اس کی ہیں' انصاف اس کا ہے' اولاد اس کی ہے' جائیداد اس کی' نام اس کا' سارا کام اس کا ہے' بلکہ پورا معاشرہ اسی کا ہے۔''

''ایسے اذیت ناک حالات میں عورت کس کے پاس دادرسی کے لئے جاسکتی ہے؟ وہ طلاق' خلع' جائیداد کا مسئلہ اگر عدالت میں لے جاتی ہے تو وہاں مجرم اور وکیل میں پہلے ہی سے سمجھوتہ رسوداہو چکا ہوتا ہے' یوں اس کا مقدمہ ایک مردانہ عدالت سے لے کر دوسری مردانہ عدالت میں جا کر ختم ہو جاتا ہے اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کیونکہ اسے انسان نہیں محض عورت سمجھا جاتا ہے۔''

جدید تحریک نسواں کے اہم ترین اہداف میں سے ایک یہ ہے کہ خاندان کے موجودہ ڈھانچے کو تبدیل کیا جائے۔ ان کے خیال میں خاندان کا ادارہ عورتوں کے استحصال میں آلہ کار رہا ہے۔ تحریک نسواں پر لکھنے والا شاید ہی کوئی مصنف یا مصنفہ ایسی ہو جس نے خاندانی نظام' نکاح اور شادی وغیرہ کو شدید تنقید کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ دفتروں اور فیکٹریوں کی ملازمتوں کے مقابلے میں خاتون خانہ کا کردار انہیں ہمیشہ گھٹیا اور حقیر نظر آتا ہے۔ اسی لئے اس تحریک کے لٹریچر میں گھریلو زندگی سے بغاوت کی بھرپور تبلیغ ملتی ہے۔ زندگی کے ہر دائرے میں مرد وزن کی غیر فطری مساوات کا قیام ان کا نصب العین ہے۔ یورپ کی تحریک آزادئ نسواں اپنے فکر وعمل کے اعتبار سے ''آوارگی نسواں'' کا روپ دھار چکی ہے۔ یہ تحریک بیسویں صدی کا عظیم ترین فتنہ ہے جس نے عالمی سطح پر خاندانی نظام کی تباہی میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں دانشور طبقہ خاندانی اقدار کی بحالی پر زور دے رہا ہے' مگر ہمارے ہاں خاندانی نظام کو عدم استحکام کا شکار کرنے کی جدوجہد روز بروز تیزی پکڑ رہی ہے۔ عورتوں کے حقوق کے نام پر ایسے ایسے مطالبات پیش کئے جارہے ہیں جو اسلامی تعلیمات اور ہماری سماجی اقدار سے براہ راست متصادم ہیں۔ اگر عورتوں کے حقوق کی جدوجہد کو اسلامی تعلیمات کے دائرے تک محدود نہ رکھا گیا تو ہمارے ہاں بھی خاندانی نظام کو تباہی سے بچانا مشکل ہو جائے گا۔(۱)

---

(۱) (ادارہ) اس مضمون سے مکمل اتفاق کے باوجود یہ کہے بنا چارہ نہیں کہ آزادئ نسواں کے نام پر آوارہ خیالی اور خاندانی ومعاشرتی اقدار سے بغاوت کی جو تحریک عالمی سطح پر اور خاص طور پر مشرقی اور بالخصوص مسلم معاشروں میں چلائی جارہی ہے اس کو اپنے جذباتی استدلال کے لئے مسالہ ہمارے معاشروں سے ہی ملتا ہے۔ مسلم معاشرہ میں اور خصوصا اس کی غریب اور کم پڑھی لکھی اکثریت میں عورتوں کی حالت واقعی قابل رحم ہے' اور اس کے کئی پہلو کھلے طور پر اسلام کے خلاف ہیں۔ عورتوں کے مسائل کو حل کئے بغیر اور ان کو اسلام کی دی ہوئی مکمل رعاتوں اور حقوق دیئے بغیر کسی طرح آپ اس جذباتی تحریک کو اس سے نہیں روک پائیں گے کہ وہ آپ کی عورتوں کو (جن کے اندر شکایت کی نفسیات پہلے ہی پیدا ہو چکی ہیں) اور اسی طرح اسلام سے ناواقف لوگوں کو اپنے معاشرتی نظام سے بدگمان کرنے میں کامیاب ہو جائے۔